# اقبال کا فن

مرتبہ : پروفیسر گوپی چند نارنگ ، دہلی ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،
۱۹۸۳ء ، صفحات ۳۴۶ ، قیمت : ۵۰ روپے
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے فلسفہ کی تشریح اور پیغام کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے روایتی شاعری سے انحراف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نہ تو گل و بلبل کے تذکرے ہیں، نہ ہجر و وصال کی داستانیں، نہ محبوب کی کج نگاہی اور بے وفائی کی شکایتیں۔ ان کے یہاں پیغام ہے، ساری انسانیت کے لیے۔ یہ پیغام ہے اثباتِ حیات کا، عرفان ذات کا، تحفظِ خودی کا اور اپنی ہستی کو بلند کرنے کا، اتنی بلندی پر پہنچنے کا کہ خدا بھی اس کی قسمت بنانے میں خود اس سے مشورہ کرنے لگے۔ وہ تعلیم دیتے ہیں تسخیر حیات کی اور عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کی۔ اس سے زندگی میں حرکت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان 'انسانِ کامل' بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہمت اور عظمت کے منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے انھوں نے شاعری کا سہارا لیا، جو نثر کے مقابلہ میں زیادہ موثر اور مقبول ذریعہ ہے۔ اس میں بھی انھوں نے نظم کو اپنایا کیونکہ انھیں احساس تھا کہ صنفِ غزل ان کے خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اس عالم گیر پیغام کو اپنے اندر سمو سکے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے نظم کے وسیع و عریض میدان میں قدم رکھا اور اس میں اپنے نغمے گائے۔

اقبال ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے، فلسفی تھے، سیاسی مفکر اور پیغامبر تھے۔ ان کی یہ ہمہ جہتی متقاضی تھی اس امر کی کہ اس پر سیر حاصل تبصرے ہوں اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح تعین ہو۔ اس میں فن اور فکر کے ساتھ ان کی ذات اور شخصیت کا معرضِ بحث میں آنا بھی بدیہی امر تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت، ان کے شاعرانہ اعجاز، فلسفیانہ بصیرت اور پیغام کی ہمہ گیری اور وسعت پر مختلف زاویوں سے لوگوں نے گفتگو کی ہے۔ اس طرح اقبال سے متعلق جو لٹریچر عالمِ وجود میں آیا ہے اس میں کتابوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق، تقریباً دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ مضامین کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ مقبولیت فقید المثال ہے۔ لیکن اس میں یہ پہلو بڑا افسوس ناک ہے کہ اقبالیات کے اتنے ضخیم لٹریچر میں اقبال کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ان پر جتنا بھی لکھا گیا ہے، اس میں زیادہ تر یک طرفہ باتیں کہی گئی ہیں۔ یہ سب تعریف و توصیف ہے جو محض عقیدت مندی اور نیاز مندی پر مبنی ہے۔ اس میں اقبال کو ایک آئیڈیل اور صنم بنا کر پیش کیا گیا ہے، ایسا ہیرو جس کا کوئی کمزور پہلو نہیں ہے اور جس سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ اسی کے نتیجے میں ہم علامہ کی اصل شخصیت سے اب تک کما حقہ واقف نہیں ہو سکے ہیں۔

اس طرح بحیثیت شاعر، فلسفی، پیغامبر اور فن کار اُن کا معروضی مطالعہ بھی ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں نقد و نظر کا انداز کم، تعریفی اور توصیفی طرز زیادہ ہے۔ اس کا بنیادی سبب غالباً یہ ہے کہ اقبال کو خالص اسلامی شاعر تصور کر لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اقبال نے اپنے پیغام کی اساس قرآن اور سنت کی تعلیمات پر رکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کر کے ہی انسانیت کی فلاح ممکن ہے۔ اس طرح ان کا یہ پیغام تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہے اور اس کا دائرہ عالم گیر ہے۔ لیکن جذبۂ اسلامی سے سرشار حضرات نے انھیں صرف مسلمانوں کا شاعر بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال پر تنقید کو براہ راست اسلام پر تنقید تصور کیا جانے لگا۔ ایسے توہمات کا اثر یہ ہوا کہ آج تک نہ تو اقبال کی صحیح تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئی، نہ ہی بحیثیت شاعر اور بحیثیت فنکار ان کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہو سکا۔ ان پر اب تک جتنے نقد و تبصرے ہوئے ہیں، ان میں اقبال کے فلسفہ اور پیغام سے بحث کی گئی ہے، فنِ شعر سے بڑی حد تک صرفِ نظر کر لیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ اس میں تصویر کے دوسرے رخ کے سامنے آنے کے امکانات زیادہ قوی تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبۂ اردو لائق مبارکباد ہے کہ اس نے اس کمی کو محسوس کیا کہ اقبال صدی تقریبات کے سلسلہ میں ۲۶ر اور ۲۷ر مارچ ۱۹۷۸ء کو جو سمینار منعقد کیا اس کو اقبال کے فن اور شاعرانہ کمال کے تجزیے اور جانچ تک محدود رکھا۔ اگرچہ اس میں بھی کہیں کہیں عقیدت مندی کا عنصر غالب نظر آتا ہے تاہم اسے اقبال کے فن اور شاعرانہ اعجاز کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'اقبال کا فن' کے عنوان سے ترتیب دے کر شائع کر دیا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ عمل

بہت مستحسن ہے اور پوری اردو دنیا کی طرف سے شکریہ کا مستحق۔ مقالہ نگاروں میں
یوسف حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر گیان چند جین، جناب سید حامد
پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وحید اختر، پروفیسر گوپی
آزاد، پروفیسر مسعود حسین خاں، وارث علوی اور خود گوپی چند نارنگ جیسے ماہر
محققین ادب، ناقد اور دانشور شامل ہیں۔ کتاب کو شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم
کے دیباچہ سے مزین کیا گیا ہے۔ اس دیباچہ کی قدر و قیمت اس لیے اور
بڑھ جاتی ہے کہ ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ شیر کشمیر کی آخری ادبی تحریر ہے
شیخ صاحب نے کشمیر سے علامہ اقبال کے تعلق پر زور دیا ہے۔ کشمیر کی جنگ
آزادی سے اقبال کی دلچسپی اور ان کے قائدانہ رول کو خراج عقیدت پیش
کرتے ہوئے شیخ صاحب فرماتے ہیں:

"کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اقبال براہ راست اس سے
وابستہ ہو گئے۔ کشمیر کمیٹی کے نام سے پنجاب میں اس تحریک کو تقویت پہنچانے
کے لیے جو کمیٹی بنی اس کے سرگرم رکن تھے۔ بعد میں وہ اس کمیٹی کے صدر
بن گئے اور ہمارا ان کا گہرا رابطہ قائم ہوا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے،
سیاستداں نہیں لیکن آزادی کی تحریک کو چلانے کے لیے انھوں نے
ہماری صحیح رہنمائی کی اور وقتاً فوقتاً ہمیں مشورے دیتے رہے۔ اقبال
پر فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا الزام لگانے والے کو یہ سن کر شاید تعجب ہو
کہ میں نے سیکولرزم اور نیشنلزم کا پہلا سبق اقبال ہی سے لیا ہے۔"

شیخ صاحب کو کشمیر سے جو لگاؤ تھا اور کشمیریوں کے لیے اُن کے دل میں جو تڑپ
تھی اس کا مقتضا یہی تھا کہ وہ علامہ کے کارناموں کو صرف کشمیر کے ہی تناظر
دیکھیں۔ ان کی نظر اقبال کی بین الاقوامی حیثیت پر نہیں جا سکتی تھی۔

اس مجموعہ کا پہلا مقالہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مرحوم) کا ہے۔ عنوان ہے: "اقبال کے کلام میں جلال و جمال کی آمیزش"۔ یوسف صاحب سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ یہی صفات اُن کی تصانیف میں بھی نمایاں ہیں۔ اقبالیات ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ 'روحِ اقبال' اور 'حافظ اور اقبال' کا جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے، وہ یوسف صاحب کی بالغ نظری، وسعتِ مطالعہ اور بلندی افکار سے بخوبی واقف ہوں گے۔ آپ نے غالب اور اقبال کے کلام میں جمالیاتی عناصر کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ 'غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات' اس کا بہترین ثبوت ہے۔ اقبال کے تصور جلال و جمال سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا، غالباً اس لیے کہ آپ خود اس کا بہترین مظہر تھے۔ زیر نظر مقالہ کی خوبی یہ ہے کہ یوسف صاحب نے اپنے مطالعہ کو صرف اقبال تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اردو فارسی شاعری کے اہم رجحانات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان سلاسل کا پتہ لگایا ہے جن سے اقبال نے فیضان حاصل کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا ان کا یہ تجزیہ بڑا حقیقت پسندانہ اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے:

"اقبال نے اپنی شاعری میں جلال و جمال کی آمیزش، اجتماعی معنویت پیدا کرنے کے لیے کی ہے۔ خودی کے استحکام کے ساتھ اس نے جدید علوم (سائنس) کے حصول پر بھی بہت زور دیا تاکہ اہلِ مشرق میں تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا ہو۔ وہ سکونی دروں بینی کے بجائے متحرک بروں بینی کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا، تاکہ انفس و آفاق دونوں کو بصیرت حاصل ہو۔ انفس کی حد تک خودشناسی کا احساس اور آفاق کی حد تک سائنس کی تعلیم کو جماعت کے امراض کا علاج تجویز کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع دھیمے اور نرم لہجے میں نہیں بیان کیا جا سکتا تھا۔ اسے پیش کرنے کے لیے اُس نے دہی

نے بڑی خوبصورتی اور اختصار سے اقبال کے مطابق تھی - [illegible]
میں کہا ہے وہ جلال و جمال کی آمیزش کا ذکر نہ کرتے لیکن ان کے
اسلوب و ہیئت میں تخئیلی طور پر وہ پوشیدہ رہتے ہیں ان کی [illegible]
توانائی محسوس ہوتی ہے۔"

مجموعی طور پر مقالہ بہت جامع اور مدلل ہے - پورے مقالہ پر عقیدت کا عنصر غالب ہے -

سرور صاحب زبان کے بادشاہ ہیں - زبان کی شیرینی، شگفتگی اور تازگی جتنی سرور صاحب کی تحریروں میں ملتی ہے، دوسری جگہ دیکھنے میں کم آتی ہے - تحریر و تقریر دونوں میں ان کی یہ خوبی برقرار رہتی ہے - زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کا مقالہ "خضرِ راہ - ایک مطالعہ" کے عنوان سے ہے - یہ عنوان اگرچہ سرور صاحب جیسے بلند پایہ ناقد اور عظیم دانشور کے منصب سے فروتر ہے، تاہم یہاں بھی آپ نے اپنی ناقدانہ بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں - البتہ اتنا ضرور ہے کہ نظم کے فنی محاسن اور تکنیک کے رموز منکشف کرنے کی بجائے "خضرِ راہ" کے پس منظر پر زیادہ زور دیا گیا ہے حالانکہ سیمینار کا مقصد اقبال کے فن سے بحث کرنا تھا - تمہید کے طور پر اقبال کی فکر سے عمومی بحث کرتے ہوئے سرور صاحب بڑے پتے کی بات کہہ گئے:

"اقبال کے یہاں حکمت ایک ربط، سنجیدگی اور تسلسل رکھتی ہے - یعنی ان کے شعری افکار میں ہمیں ایک وحدت ملتی ہے - مگر یہ وحدت لازمی طور پر ان کی عظمت کی دلیل نہیں ہے - شیکسپیئر اور غالب کے یہاں ہمیں ایک ایسی آزاد حکیمانہ نظر ملتی ہے جو کسی مخصوص نظریے یا تصورِ حیات کی پابند نہیں ہوئی - ان شعراء کے یہاں زندگی اپنی پوری پہنائی، بوقلمونی، رنگا رنگی اور تضادات کے ساتھ جلوہ گر ہے - دانتے یا ملٹن یا ٹیگور یا اقبال کے یہاں ان

پہلوں کو ایک خاص نظریے کی عینک سے دیکھا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر غالب کی آزاد وحدت کو بڑا درجہ دیتا ہوں۔ مگر میرا مطالعہ اور محدود بصیرت مجھے یہ کہنے پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ دانتے یا ملٹن، یا ٹیگور یا اقبال یا ڈبلو۔ بی۔ییٹس یا ایلیٹ کی عینک کا نہ صرف شاعری میں جواز ہے، بلکہ وہ بھی بڑے شاعری کے دائرے میں آتے ہیں۔ ادب میں آزاد وحدت اور مخصوص وحدت، دونوں کی گنجائش ہے۔"

اس قسم کی بے لاگ اور بصیرت افروز رائے سرور صاحب جیسے صاحب بصیرت نقاد ہی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کا اصل میدان 'لسانیات' ہے۔ لیکن انھوں نے دوسرے ماہرین لسانیات کی طرح لسانیات کو محض نظریے تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، نہ ہی اس کی تطبیق صرف نثری ادب تک ہی رکھی ہے، بلکہ انھوں نے اطلاقی لسانیات (APPLIED LINGUISTICS) کا دائرہ عمل شاعری کے میدان تک پھیلا یا ہے۔ آپ نے اردو کے متعدد شعراء کے کلام کو لسانیات کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ان کے صوتیاتی نظام کی تشریح کی ہے۔ متذکرہ سمینار میں آپ نے اقبال کی دو شاہکار نظموں "خضر راہ" اور "مسجد قرطبہ" کی لسانیاتی نقطۂ نظر سے بازآفرینی کی کوشش کی اور حق تو یہ ہے کہ مطالعہ کا حق ادا کر دیا۔ اس مقالہ میں آپ نے ان دونوں نظموں کے سیاسی پس منظر اور اس کے اثرات سے پیدا ہونے والی اقبال کی ذہنی کشمکش سے بحث کی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے فنی محاسن پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نتیجہ میں تفہیم اقبال کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

'اقبال کے کلام میں تضمین اور ترکیب' سید عامد صاحب کا مقالہ ہے جو کافی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ اس میں دوسرے شعراء کے ان اشعار سے

بحث کی گئی ہے جنھیں اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں بطور تضمین استعمال کیا ہے یا ان کے کسی حصہ کو اپنے مصرعوں میں بطور ترکیب باندھا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بطور تمہید تضمین کی تعریف بیان کی ہے اور اس کے مختلف اقسام بتائے ہیں۔ اس طرح تضمین کی مفصل، جامع اور مستند تعریف و تشریح پہلی بار دیکھنے میں آتی ہے۔ رشید صاحب نے جس شرح و بسط اور گہرائی سے اقبال کی تضمینوں سے بحث کی ہے وہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور ہمہ گیری کا مظہر ہے۔ اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو حرفاً حرفاً پڑھنا اور اس میں دوسرے شعراء کے اشعار اور مصرعے تلاش کرنا بڑی عرق ریزی کا اور محنت طلب کام ہے۔ اس قسم کے مطالعہ میں دلچسپی کم، اکتاہٹ زیادہ ہوتی ہے اس لیے عام طور پر اس کے مطالعہ سے گریز کرتے ہیں حالانکہ اسی نوع کا مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ سید حامد صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اقبال کا یہ مشکل اور وقت طلب مطالعہ کیا اور اس کو انتہائی دلچسپ اور مفید انداز میں پیش کیا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن اشعار کو اقبال نے بطور تضمین یا ترکیب استعمال کیا ہے، ان کے خالقوں کی نشاندہی بھی کر دی جاتی تو مقالہ مزید معلوماتی اور مفید ہو جاتا۔ یہ ایک نفسیاتی مسلّمہ ہے کہ جب تک فن کار کا علم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک فن پارہ سے کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ اس کے علاوہ بھی چند باتیں مزید محلِ نظر ہیں۔ مثلاً سید صاحب فرماتے ہیں:

"اقبال کے یہاں تضمین کا احسان دو طرفہ ہے۔ نظم کو تضمین سے چار چاند لگ جاتے ہیں، اور جس شعر پر تضمین کی گئی اقبال حسنِ تضمین سے اسے معنویت، نیا رُخ اور تموّل عطا کر دیتا ہے۔"

یہ بات کچھ اقبال ہی سے مختص نہیں ہے۔ ہر بڑا شاعر جب بھی کسی شعر کی تضمین کرتا ہے وہ اس شعر کو رفعت اور بلندی بخش دیتا ہے اور یہی تضمین کی خوبی بھی ہوتی ہے۔

وہ تضمین جو شعر کو نیا مفہوم عطا نہیں کرتی اور جو اس کو نئے افق سے آشنا نہیں کرتی، اصل تضمین نہیں ہوتی اس لیے اس کو زیرِ بحث بھی نہیں لایا جا سکتا۔

ایک جگہ سید صاحب لکھتے ہیں: "نصیحت نام کی نظم بارہ شعروں پر مشتمل ہے۔" یہاں راقم الحروف کو لفظ نام پر اعتراض ہے۔ ایسے مواقع پر عنوان کا استعمال زیادہ مناسب رہتا ہے۔ اسی طرح فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال: "گویا یہ تضمینیں نہ صرف فارسی زبان و ادب سے اقبال کے شغف کو ظاہر کرتی ہے، بلکہ اقبال کے فارسی کلام کا پیش خیمہ ہیں" بھی مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

مقالہ کے دوسرے حصہ میں اقبال کی مخصوص ترکیبوں سے بحث کی گئی ہے اور بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم وغیرہ سے اس قسم کی تمام تراکیب کو زمانی اعتبار سے پیش کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ "ترکیب سازی کا ارتقاء شاعری کے دوش بدوش چل رہا ہے۔ اقبال کی مخصوص تراکیب سے تفصیلی بحث یوسف حسین خاں صاحب 'روحِ اقبال' اور 'حافظ اور اقبال' میں بہت پہلے کر چکے ہیں۔

پروفیسر گیان چند ہمارے محققین اور ناقدین میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ سنجیدگی، متانت اور خیال کی گیرائی آپ کے طرۂ امتیاز ہیں۔ فنِ عروض پر بھی آپ کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ آپ نے اردو کے مختلف شعراء کے کلام کو عروض کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس سے دلچسپ اور معنیٰ خیز نتائج برآمد کیے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کا مقالہ "اقبال کے اردو کلام کا عروضی مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ غالباً یہ اپنی نوعیت کی اولین کوشش ہے۔ اس میں اقبال کے مکمل اردو کلام کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس کے لیے دو جدولیں بنائی گئی ہیں۔ پہلی جدول میں اشعار کے اوزان کا شمار کیا گیا ہے۔ اس میں اوزان کو کثرتِ استعمال کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ یعنی سب سے پہلے وہ وزن لیا گیا ہے جس میں اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد اس سے کم مستعمل

وزن ۔ اس طرح پوری جدول (DESCENDING ORDER) میں پیش کیا گیا ہے ۔ دوسری جدول میں اشعار کے بجائے نظموں اور غزلوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ اس میں بھی اولیت اُس وزن کو دی گئی ہے جس میں اقبال نے سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں ۔ ان دونوں جدولوں میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز سے علیٰحدہ علیٰحدہ اشعار کی تعداد اور نظموں کی تعداد کو دکھایا گیا ہے ۔ یہ کام بڑی عرق ریزی اور پتے ماری کا ہے ۔ ایک ایک شعر کو شمار کرنا اور پھر انھیں بحر کے اعتبار سے مجموعہ تعداد کا شمار کرنا اور پھر انھیں بحر کے اعتبار سے ترتیب دے کر مجموعہ تعداد کا شمار کرنا، جتنا مفید کام ہے، اتنا ہی مشکل اور ہمت شکن بھی ہے ۔ اس کے باوجود حسین صاحب نے اس کام کو انجام دیا اور اس صورت سے پیش کیا کہ حق ادا کر دیا ۔

اقبال کوئی بہت بڑے عروضی نہیں تھے ۔ اس کے عوامض پر ان کی نظر نہیں تھی انھیں صرف حسبِ ضرورت اس میں مہارت حاصل تھی، اس لیے اگر ان کے کلام کا دقیق اور گہرا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اکثر مقامات پر ان سے کچھ تسامحات ہو گئے ہیں جن میں کچھ تو بہت واضح ہیں اور کچھ فروعی اور غیر اہم ۔ ڈاکٹر گیان چند نے ان سب کی نشاندہی کی ہے اور بہت محتاط الفاظ میں ان غلطیوں اور کمزوریوں کو بیان کیا ہے ۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری انگریزی کے عدیم المثال اسکالر ہیں ۔ اپنے انگریزی تجربات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا ملکہ رکھتے ہیں ۔ اردو نقادوں میں آپ کی منفرد لے ہے، ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں انگریزی خیالات، انگریزی الفاظ اور انگریزی محاورات کی کثرت ہوتی ہے ۔ یہ طرز ابھی تک اردو میں نامانوس ہے ۔ آپ کی تحریروں کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ عام قاری کی اس تک رسائی نہیں ہوتی ۔ آپ

کے مقالہ کا عنوان ہے "اقبال کے ہاں تصورات کی شاعری"۔ مقالہ آپ کے مخصو
انداز فکر اور منفرد طرز بیان کا آئینہ دار ہے۔ اس میں بھی انگریزی الفاظ اور مصط
کی کثرت ہے جس سے عبارت کا تسلسل مجروح ہو جاتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کے پرستاروں میں ہیں۔ آپ کا مقا
"تربیات اقبال کا تنقیدی جائزہ" بڑا دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ اس سے
اقبال کی شاعری کے ارتقائی منازل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علامہ سید سلیما
ندوی اور علامہ اقبال میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ سید صاحب عالم دین ہو
کے ساتھ ساتھ ماہر لسانیات بھی تھے۔ اقبال ان کی زبان دانی کے معترف تھے
۱۹۱۸ء میں 'رموز بیخودی' شائع ہوئی۔ سید صاحب نے 'معارف' (اپریل ۱۹۱۸ء
میں اس پر طویل تبصرہ شائع کیا جس میں 'رموز بیخودی' کے محاسن بیان کرنے کے ساتھ
ساتھ، زبان و بیان کی فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارے کئے گئے تھے۔ علامہ
اقبال کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی کہ انھوں نے اس تبصرے کو نہ صرف سراہا بلکہ سید صاحب
سے بالاصرار اس کی تفصیل بھی معلوم کی۔ اور جب سید صاحب نے ان فروگذاشتوں
اقبال کو آگاہ کیا تو علامہ نے ان میں سے بیشتر اعتراضات کا اعتراف کیا لیکن چند
باتوں سے اتفاق نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اپنے دفاع میں بہت سے فارسی اساتذۂ
سخن کے کلام اور مختلف کتب لغات سے اسناد پیش کیں۔ اس سے اقبال کی وسعت
مطالعہ اور عمیق نظری کا پتہ چلتا ہے۔ سید صاحب کے علاوہ نواب صدر یار جنگ
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بھی متعدد بار اقبال کی توجہ ان کی فروگذاشتوں
پر مبذول کرائی۔ علامہ نے ان کو بھی بہ نظر تحسین دیکھا اور ان سے ہمیشہ ایسے
کرتے رہنے کی درخواست کی اور ایک بار تو یہاں تک لکھا: "آپ نے جو ریمارکس
اس کے اشعار پر لکھے ہیں ان کے لیے آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ لوگ

...ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں گے

جناب آزاد نے اپنے زیرِ نظر مقالے میں ان مباحث کو پیش کیا ہے جس کے لیے محققین ادب اور ماہرینِ لسانیات کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس مقالے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے اور سچے فنکار کی مانند اقبال بھی اپنی تخلیقات کو ہمیشہ ...ب سے خوب تر بنانے کی فکر میں رہتے تھے اور مختلف اوقات میں حک و اصلاح کا ...ل جاری رکھتے ہوئے اپنے کلام کو سنوارتے رہتے تھے۔

اقبال کے کلام میں الفاظ بڑے منظم اور مربوط سلسلے سے استعمال ہوئے ہیں۔ ...قبال نے رعایتِ لفظی کا خصوصی اہتمام کیا ہے اور اس کے ذریعہ کلام میں حسن پیدا کیا ہے ...ن کے کلام کی صحیح تفہیم کے لیے اس صوتی اور لفظی نظام کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہی نظام ...ن کے کلام میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے غالب سے بڑا فیضان حاصل کیا ہے۔ فن شاعری میں وہ سب سے زیادہ غالب کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تفحص الفاظ اور ان کے برجستہ استعمال کا جو سلیقہ ہے اس پر غالب کے فن کی چھاپ نظر ...تی ہے۔ لیکن اس خوبصورتی سے کہ اس میں اقبال کی انفرادیت اور ORIGINALITY ...شان دوبالا ہو گئی ہے۔ غالب کے علاوہ میر تقی میر، میر انیس اور مومن کے یہاں بھی ...نظام انتہائی دلآویز اور ترقی یافتہ شکل میں ملتا ہے۔ اقبال بھی اس زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔ مگر ذرا سے فرق کے ساتھ میر، غالب، انیس اور مومن کے یہاں یہ فطری ...نداز میں ہے، اسی لیے اس میں آمد کی جلوہ گری زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف اقبال ...ے یہاں یہ صنعت کوشش، ریاضت اور محنت شاقہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس ...یے اس میں کہیں کہیں غیر فطری پن آگیا ہے اور آورد کی بالادستی قائم ہو گئی ہے۔

جناب شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مقالے 'اقبال کا لفظیاتی نظام' میں اقبال ...ی اسی خصوصیت سے بحث کی ہے اور ان کے کلام میں رعایتِ لفظی کا بالخصوص تفصیلی

ازدیا ہے۔ مقالے کی تمہید طویل ہے ۔ پچیس صفحات پر مشتمل مقالہ میں تقریباً آٹھ
لے اس ہی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اصل موضوع سے گفتگو بارہ صفحے سے زیادہ میں
یں ہے ۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس مقالے میں اقبال کے مکمل کلام کا
اطہ کیا جائے گا لیکن مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں صرف ایک نظم "ذوق و شوق"
موضوع بحث بنایا گیا ہے ۔ یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ فاروقی صاحب نے
ی گفتگو کے دوران صرف یوسف سلیم چشتی کی آراء سے بحث کی ہے حالانکہ دوسرے
ہرین اقبالیات نے بھی اقبال کے صوتی نظام پر روشنی ڈالی ہے ۔ ان میں
سف حسین خان صاحب کا اسم گرامی سرفہرست ہے ۔ آپ نے 'روحِ اقبال' اور
فظ اور اقبال' میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں ۔ ان کی موجودگی میں
روقی صاحب کی یہ شکایت کہ: "اقبال کا کلام رعایت لفظی سے اتنا ہی مملو ہے، جتنا
سب کا کلام ہے ۔ لیکن بوجوہ نقادوں کی نگاہ اس نکتے پر نہیں پڑی ہے" کچھ زیادہ
قت پسندانہ معلوم نہیں ہوتی ۔ فاروقی صاحب کی یہ رائے کہ: "واقعہ یہ ہے کہ اقبال
لام اپنی انفرادیت کے باوجود اجنبیت کا تاثر اسی وجہ سے نہیں پیدا کرتا کہ وہ
و شاعری کی بہترین لفظیاتی روایت کا روشن نمونہ ہے" بھی محل نظر ہے ۔ یہ رائے
بال کی چند ایسی نظموں کے لیے تو درست ہو سکتی ہے جنھوں نے شاہکار کا درجہ
ل کر لیا ہے ، لیکن بقیہ کلام پر اس خصوصیت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ۔

ڈاکٹر وحید اختر کا مقالہ 'اقبال کا تصورِ فن' فکر انگیز اور پُر مغز ہے ۔ وحید اختر صاحب
ہ کے استاد ہیں ۔ آپ کی تحریروں میں چاہے وہ ادبی ہوں ، تنقیدی ہوں یا
فانہ ، سب میں فلسفیانہ انداز نمایاں رہتا ہے ۔ زیرِ نظر مقالہ میں بھی فلسفیانہ انداز
ہ ہے ۔ اس میں اقبال کے تصورِ فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔ اقبال کے تصورِ شاعری
کے فن اور لوازم فن کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے تدریجی ارتقا

[illegible] ہے۔ آپ کی اس رائے سے ہر ذی علم اتفاق کرے گا کہ "اقبال کا [illegible] جدید تجربات کے لیے مناسبت و معنویت کا حامل ہے۔" البتہ آپ کا یہ [illegible] کو ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ، "اقبال کی اپنی شاعری نے کلاسکیت سے رومانیت کی طرف سفر کیا۔ رومانیت کے اس سفر میں انھوں نے ورڈس ورتھ اور گوئٹے سے اثر قبول کیا۔ بعد میں ان کے یہاں رومانیت و کلاسکیت کا وہ امتزاج نظر آتا ہے جس کی تشکیل میں ملٹن، دانتے اور رومی کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ابتدا میں ان کے کلاسیکی آہنگ پر ٹینیسن کا اثر ملتا ہے۔ پھر ان کے یہاں بیدل اور غالب کے لہجے کی پرچھائیاں نمایاں ہونے لگیں۔"

یہ بات بالکل پہلی بار سننے میں آئی ہے کہ اقبال نے کلاسکیت سے رومانیت کی طرف سفر کیا۔ اسی طرح یہ انکشاف بھی پہلی بار ہو رہا ہے کہ اقبال کے کلاسیکی آہنگ پر ٹینیسن کا اثر ہے۔

وارث علوی کا مقالہ "شاعری، فلسفیانہ شاعری اور اقبال" کے عنوان سے ہے۔ علوی صاحب نے اقبال کے فلسفیانہ افکار اور شاعری میں ان کے اطلاق و اظہار کا تجزیہ کیا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے: "اقبال کامیو اور سارتر ہی کی مانند فلسفیانہ فکر کا استعمال زندگی کو نئی معنویت عطا کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ فلسفہ جو ان کی نثر اور شاعری میں بکھرا پڑا ہے، نتیجہ ہے ان سوالوں کے جواب پانے کا جو تجرباتِ حیات کے زائیدہ ہیں۔ جواب کی جستجو میں وہ مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں کو کھنگالتے ہیں۔ اسلامی فکر کے جھرنے پر ان کی پیاس بجھتی ہے لیکن دوسرے مکاتیبِ فکر سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے وہ ترک نہیں کرتے بلکہ اسلامی نظامِ فکر کی روشنی میں اس کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔" یہ علامہ کے فکر و فن کا بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے۔ البتہ ایک عام قاری کو جو بات کھٹکتی ہے

دوسرے مقالوں کی طرح اس مضمون میں بھی انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال بڑی کثرت سے کیا گیا ہے، جو اکثر مقامات پر غیر ضروری بھی ہے۔ اس سے عبارت کی چاشنی، شگفتگی اور سلاست مجروح ہو گئی ہے۔ مثلاً

Irony, Cosmic Dimension, Alternative Norms, Adab, Totalitarian, Explosive, Defiance Dilemma, Original, Comman Sense, Pattern, Concrete, Organic, Statement

وغیرہ الفاظ کا استعمال علوی صاحب نے بے محابا کیا ہے حالانکہ بڑی آسانی سے ان سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔ یہ الفاظ ایسے ہیں جن کے مترادفات اردو میں رائج ہیں اور نہ صرف رائج ہیں بلکہ اپنی اپنی آب و تاب، وسعت اور رفعت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان میں سے اکثر انگریزی مقابلہ میں کہیں زیادہ حسن اور جامعیت کے حامل ہیں۔

اردو میں لسانیاتی مطالعہ کا رواج عام نہیں ہے۔ ہم اب تک شعراء کے کلام کو بلندیٔ فکر، معنی آفرینی، جذبات نگاری اور طرزِ ادا کی کسوٹی پر پرکھتے رہے ہیں۔ اس طرح لسانیات کا پہلو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات کچھ اردو کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ دوسرے ادبیات میں بھی لسانیاتی اور اسلوبیاتی تنقید کا فقدان رہا ہے۔ مغربی ادبیات بھی بیسویں صدی کے ربعِ اول تک اس قسم کی تنقید سے عاری تھے۔ اس طرف سب سے پہلے غالباً آئی۔ اے۔ رچرڈز (I.A. RICHARDS) نے توجہ کی۔ اس نے اپنی معرکۃ الآرا تالیف 'Practical Criticism' (مطبوعہ لندن ۱۹۲۹) کے ذریعے ادبی تنقید پر لسانیات کی ابتدا کی۔ اس کے تھوڑا بعد ولیم ایمپسن WILLIAM EMPSON نے Seven Types of

اس کی [illegible] روایت کو آگے بڑھایا۔ ان حضرات نے شاعری [illegible]
کے ساتھ زبان اور لسانیات کے پہلو کو بھی اہمیت دی اور اس طرح [illegible]
اطلاقی لسانیات کا باب کھولا۔ اس روایت کو اس صدی کے نصف دوم کے ابتدا [illegible]
سالوں میں بلوم فیلڈ (BLOOMFIELD) نے ایک نئی سمت عطا کی۔ اس نے
فن پارے کی حسن و قبح کی شناخت کے لیے معنیٰ آفرینی کو نظر انداز کر کے ان [illegible]
ساخت اور اس کی صوتی و نحوی خوبیوں پر زور دیا اور اسلوبیاتی تنقید کو باقاعدہ
شکل میں پیش کیا۔ اردو میں اس قسم کی اسلوبیاتی تنقید کا اولین بھرپور تجربہ ڈاکٹر
مغنی تبسم کی تالیف 'فانی بدایونی' (مطبوعہ حیدرآباد : ۱۹۶۹ء) میں دیکھنے کو ملتا ہے۔
گزشتہ تقریباً پندرہ سال سے پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تنقید کا رخ اس طرف
موڑ دیا ہے۔ آپ نے غالب، اقبال اور فانی وغیرہ کے کلام کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا
ہے، اور بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس
میدان میں قدم رکھا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ نارنگ صاحب
فنِ نقد پر کامل عبور رکھتے ہیں، اور لسانیات کے غوامض سے بھی بخوبی واقف ہیں۔
آپ نے ادبی اصولِ نقد میں لسانیاتی خصوصیات کے مطالعہ کو سمو کر اسلوبیاتی تنقید کا
مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کے دو مقالات شامل ہیں۔
دونوں کا موضوع تقریباً یکساں ہی ہے۔ پہلے مقالہ کا عنوان ہے 'اقبال کی
شاعری کا صوتیاتی نظام' اور دوسرے مقالے کا "اسلوبیاتِ اقبال"۔ پہلے مقالہ میں
اقبال کے اردو کلام کے صوتیاتی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اسلوبیاتی مطالعہ
کا صرف ایک پہلو ہے۔ اپنے موضوع سے بحث کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار ایک
بات بڑے پتے کی کہہ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "آہنگ سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے
جس سے فضا سازی یا سماں بندی میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ فضا سازی کسی بھی معنیاتی

کر رہا ہو یا یکھا جا سکتا ہے۔" اس کے تناظر میں انھوں نے اقبال کے ابتدائی دور کی ایک مختصر نظم "ایک شام" کا صوتیاتی اور معنیاتی تجزیہ کیا ہے آپ کا خیال ہے کہ اقبال کے کلام میں جو چاشنی اور نغمگی ہے اس کا راز یہی ہے کہ اس میں صوتیاتی نظام بڑا منظم اور منضبط ملتا ہے اور اس حیثیت سے اقبال کا کلام رفعت کی ان منزلوں کو چھو لیتا ہے جہاں جاتے ہوئے دوسروں کے پر جلتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اقبال کے بارے میں یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ان کی آواز میں ایک ایسا جادو، ایسی کشش اور نغمگی ہے جو پوری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے لہجے میں ایسا شکوہ، توانائی، بے پایانی اور گونج کی ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی چیز گنبد افلاک میں ابھرتی .... اور پھیلتی ہوئی چلی جائے۔ اس میں دل نشینی اور دلآویزی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی برش روانی، تندی اور چستی ہے جیسے سرود کے کسے ہوئے تاروں سے کوئی نغمہ پھوٹ بہا ہو، یا کوئی پہاڑی چشمہ ابل رہا ہو۔"

اگر خود فاضل مقالہ نگار کے طرز بیان پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ہمیں مذکورہ خصوصیات میں سے بیشتر کی جلوہ گری نظر آئے گی۔ زیر نظر مقالہ میں زبان کی چاشنی بھی ہے، روانی بھی اور نغمہ کا زیر و بم بھی۔ اس حسین اور رومانی نثر کے ذریعہ مقالہ نگار نے خشک اور غیر دلچسپ موضوع کو دلچسپ اور گوارا بنا دیا ہے۔ عبارت میں یہ خوبی بڑی ریاضت اور محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب لکھنے والے کو زبان پر کامل قدرت ہو، اس کے پاس بہترین الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہو اور وہ اس ذخیرہ کو مناسب انداز میں استعمال کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو۔ پروفیسر نارنگ ان تمام صفات سے متصف ہیں، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ جن حضرات کو ان کی تقریریں سننے اور تحریریں دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور اس کی تصدیق کریں گے۔

[illegible] مقالے کے بعد مجدد [illegible]
نظموں کا صوتیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس میں حسب موقع تجزیہ اور [illegible]
محاکمہ [illegible] کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

> • اقبال کے یہاں صفیری و مسلسل آوازوں اور طویل و غناتی مصوتوں کا یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبال کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی، شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی ایسی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک و تموج اور امنگ و ولولے کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر کہی جا سکتی ہے۔

دوسرے مقالے میں اسلوبیات اقبال کا مطالعہ اسمیت اور فعلیت کے نظریے کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ چونکہ اول الذکر مقالے میں اقبال کے صوتیاتی نظام کا مطالعہ کیا گیا تھا اس لیے زیر نظر مقالے میں صرفی و نحوی امتیازات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں بھی صرف اسمیت NOMINALIZATION اور فعلیت VERBALISATION تک ہی بحث کو محدود رکھا گیا ہے۔ اس مقالے کو دراصل پہلے مقالے کے تسلسل CONTINUATION کے طور پر دیکھنا چاہئے۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے قواعد صرف و نحو سے بحث کی ہے اور افعال و مصدر کے مختلف پہلوؤں (SHADES) پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کے اردو کلام میں ان کے استعمال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک نادر کوشش ہے۔ اس نوع کا تجزیہ پہلی بار کیا گیا ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک ایسا [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ اس کیلئے کچھ خاص دل ہی مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی [illegible]

یہ مجموعہ نہیں ہیں اس لیے ان کی لے کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی ہے۔ نارنگ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی یہ تحقیق بہت دل چسپ ہے کہ اقبال کے کلام میں کہیں افعال کے مقابلہ میں اسماء زیادہ استعمال ہوئے ہیں اور نظموں کے بند کے بند افعال سے یکسر خالی ہیں اور کہیں صورت حال اس کے برعکس بھی ہے یعنی افعال کی کثرت ہے اور اسمیت کے مقابلہ میں فعلیت پر زور ہے۔ اس تبدیلی مزاج کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے وہ اقبال کے مزاج کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کی افتاد طبع کا ایک ماہر نفسیات کی طرح مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :

اس میں شک نہیں کہ اقبال جب مجرد تصورات کے بارے میں فکر کرتے ہیں یعنی زمان و مکان، یا عقل و عشق یا خودی و سرمستی ........
...... یا فقر و قلندری، تو ان کا لہجہ خاصا غیر شخصی ہوتا ہے اور اسمیت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں بند میں یہی کیفیت ہے۔ چوتھے اور چھٹے بند میں جہاں خطاب کا انداز ہے، افعال کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ ساتواں بند جس میں تاریخی صورت حال کا بیان ہے، اس میں افعال اور زیادہ استعمال ہوئے ہیں اور آخری بند جس میں منظر کاری بھی ہے، وہ پہلے بند کی اسمیت سے بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے۔ اس بند کے ہر ہر شعر میں فعل کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے۔"

اس طرح اقبال گویا اسمیت سے زیادہ کام لیتے ہیں اور اسے ایک تخلیقی حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن جلد ہی وہ اس کی حد بندی سے باہر نکل آتے ہیں اور فعلیت کے وسیع و عریض میدان میں قدم رکھتے ہیں اور اس طرح وہ اسمیت اور فعلیت کے متناسب استعمال سے اپنے کلام کو موزونی، نغمگی اور رفعت بخشتے ہیں۔ ایک عظیم شاعر

کا بھی کارنامہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے لسانیاتی امکانات بھی پیدا کیے جن سے کلام میں نحوی، صرفی اور صوتیاتی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال کے مجموعی کلام میں فعلیت کے عمل دخل کے بارے میں پروفیسر نارنگ کا یہ خیال بڑا وقیع اور اہمیت کا حامل ہے:

"فعل کا استعمال اقبال کے یہاں غیر رسمی اور نہیں ہے اور اگرچہ نئی گرامر خلق کرنے کی کوشش نہیں ملتی، لیکن یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ اقبال نے معنیاتی وسعتوں کی پیمائش میں فعلیت کے گوناگوں امکانات سے کام لیا۔ اور ایسے کی مجازیت اور عجمیت کے باوصف اسی فعلیت نے اردو سے ان کے تہہ در تہہ تخلیقی رشتے استوار رکھنے میں مدد دی۔"

مجموعی طور پر یہ مجموعۂ مقالات بہت کارآمد اور مفید ہے۔ اس سے اقبال کی تفہیم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس کے مباحث بڑے اہم ہیں اور جس انداز سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ انتہائی معیاری ہے۔ اس سے مقالہ نگاروں کے افکار کی بلندی، تخیل کی رفعت، مطالعہ کی وسعت اور زبان قدرت ٹپکتی ہے اس لئے ہم اس مجموعہ کو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ اقبالیات پر اس وقت جتنا لٹریچر موجود ہے۔ اس میں زیر نظر مجموعہ کو ایک امتیازی شان حاصل ہوگی، اس لیے کہ یہ باطنی حسن کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی مزین ہے۔ اسکی کتابت اور طباعت بھی بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ پروفیسر نارنگ کو کتابیں ترتیب دینے اور انھیں حسین انداز میں شائع کرانے کا ملکہ حاصل ہے۔ "منشورات" اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں "اسلوب افسانہ: روایت اور مسائل" اور "انیس شناسی" کو اس دعوے کے ثبوت میں بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ [illegible]

[illegible] نارنگ صاحب کی خوش سلیقگی، حسن ترتیب [illegible] [illegible] مطالعات کو نئی سمت عطا کی ہے۔ اس کا ٹائٹیل نہایت جاذب نظر اور دیدہ زیب ہے۔ اس کی کتابت جناب خلیق ٹونکی نے کی ہے جو اس وقت بلاشبہ ہندوستان کے بہترین خطاط ہیں۔ ایسا حسین وجمیل مرقع پیش کرنے کے لیے فاضل مرتب لائق مبارکباد ہیں۔

آخر میں اتنا ضرور عرض کرتا چلوں کہ ان تمام اوصاف کے باوصف چند باتیں ایسی بھی ہیں جو کھٹکتی ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ اس میں مقالہ نگاروں کا تعارف نہیں ہے۔ یہ بات جدید ترین اصولوں کے منافی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے زیادہ تر حضرات ادب میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں اور ہند و بیرون ہند کے ادبی حلقوں میں کافی معروف ہیں۔ تاہم ان میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جنھیں ابھی شہرت اور ناموری کے مراحل سے گذرنا ہے۔ لہذا ان تمام شرکاء محفل کا تعارف کرا دیا جاتا تو عام قاری کے لیے یہ مجموعہ اور بھی زیادہ مفید ہو جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اشخاص، اماکن اور کتب وغیرہ کا اشاریہ بھی نہیں دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے مجموعۂ مضامین میں اشاریے کا رواج نہیں ہے۔ غالباً اسی لیے فاضل مرتب نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن ایک جامع اور تفصیلی اشاریے کی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسے شامل کر دیا جاتا تو یہ یقیناً ایک خوش آئند اضافہ ہوتا اور کتاب کی افادیت بھی بڑھ جاتی۔